ہارورڈ یونیورسٹی کے ایک ڈاکٹر کینن نے ایک بار ایک بلّی پر خوف کے جذبہ کا تجربہ کیا، اس نے ایک بلّی کو جس کا نظامِ ہاضمہ نہایت صحت و توازن کے ساتھ کام کر رہا تھا، ایک کمرے میں کتّے کے ساتھ چھوڑ دیا۔ خوف کے جذبہ کی نادیدہ لہر نظامِ ہاضمہ سے ٹکرائی اور ایکسرے نے بتایا کہ ۴ گھنٹہ کامل تک اس کے ہاضمہ کا نظام قطعی معطل ہو کر رہ گیا!

ذہنی تصورات کس طرح نظامِ جسمانی پر اثر انداز ہوتے ہیں اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے، ایک طالبِ علم کو یہ کامل یقین تھا کہ انڈا کھا کر اس کو امتلاء کی شکایت ہو جاتی ہے، لیکن کچھ ماہرین نے جب اس کو خفیہ طور پر متعدد انڈے کھلا دیئے تو اس کے اوپر امتلاء کا وہ یقینی اثر جو مخصوص افتادِ طبع کی رُو سے ہونا چاہئے تھا ہلکے سے ہلکے انداز میں بھی نہیں ہوا۔؟

جذبات و خیالات کے دباؤ سے جو ذہنی تھکان پیدا ہوتی ہے اُس کا بے پناہ اثر پورا نظامِ جسمانی قبول کرتا ہے۔

میری بینن رے نے اپنی کتاب "ہم کس طرح کبھی بھی ذہنی تھکن کا شکار نہ ہوں؟" میں لکھا ہے کہ:۔

"جسمانی شکستگی کی کہنہ شکایت جذبات کی پیداوار ہوتی ہے جس سے چھ ماہ تک آرام کرکے بھی نجات ممکن نہیں۔"

آگے چل کر یہ دہشت ناک انکشاف کیا گیا ہے کہ:۔

"ذہنی تھکان کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے نتیجہ میں شریکِ حیات ۔ گھر کی رانی اور شمعِ انجمن کی بینائی زائل ہوسکتی ہے اور گھر کا مالک ۔ شوہر اپاہج ہو سکتا ہے۔"

ایک دوسرے ڈاکٹر نے بڑے پُر مزاح اور ساتھ ساتھ سنجیدہ انداز میں لکھا ہے کہ:۔

"غذا کے متعلق یہ ذہنی شک کہ وہ نقصان پہونچادے گی، معصوم سے معصوم غذا کو صحیح ترین نظامِ ہاضمہ میں مضرت انگیز بنا دینے کے لئے کافی ہے۔ اکثر معدے کی شکایات معدہ نہیں غذا نہیں ۔ بلکہ "صاحبِ معدہ" کی بدعنوانیوں کا کیفرِ کردار ہوتی ہیں۔"

نظامِ ہاضمہ پورے جسمانی نظام کا کلیدی شعبہ ہے، یہ پورے جسم کی صحت پر اثر انداز ہوتا ہے، علم العلاج کے

نقطۂ نظر سے دانتوں اور آنکھوں کے تقریباً تمام امراض کی تہ میں ہاضمہ کا کچھ نہ کچھ فتور دخل رکھتا ہے، ہاضمہ کی خرابی ام الامراض "قبض" کی شکل اختیار کرکے پورے جسمانی ڈھانچے کو تہ و بالا کر سکتی ہے، وغیرہ وغیرہ۔

اس لئے نظامِ ہاضمہ پر جذبات و خیالات کا فیصلہ کن اثر پورے نظامِ جسمانی پر اس کی اثر اندازی کے ہم معنی ہے، یہی وہ راز ہے جس کو پاکر ڈاکٹر ڈی شین (DE - CHANE) لکھتا ہے کہ:۔

"طبی زاویۂ نظر سے صالحیت قویٰ (VITALITY) کا مطلب یہ ہے کہ انسانی جسم کے تمام بیشمار خلیئے صحیح طور پر کام کر رہے ہیں......

صالحیت قویٰ لازماً تین قسموں پر تقسیم ہونی چاہئے۔ جسمانی صالحیتِ قویٰ، دماغی اور اعصابی — ایک اور چوتھی قسم بھی ہے، جو بجا طور پر ان تینوں اقسام کے مقابلہ میں کہیں زیادہ عظیم اہمیت کی حامل کہی جا سکتی ہے اور وہ ہے روحانی صالحیتِ قویٰ۔"

درحقیقت یہ "روحانی صالحیت" ہی ہے جس میں نہ صرف فرد کے جسم بلکہ پورے معاشرے کے حفظانِ صحت کی اصل بنیاد رکھی ہوئی ہے، دیکھئے نا، جذباتی اور روحانی سکون و راحت کے بغیر ہم جسمانی صحت کا توازن قائم رکھنے میں کیسے بے بس و لاچار ہیں! کش مکش، نفرت، غصّہ اور خوف ہمارے باہمی سماجی رشتوں سے امنڈ امنڈ کر ہمارے اپنے نظامِ جسمانی پر ضرب لگاتے ہیں، ایسی حالت میں وہ روحانی فساد اور اخلاقی بگاڑ جو جسم پر مہلک اثرات ڈالتا ہے اسی روح کی صالحیت اس مرض کا علاج بھی ہے۔

اس طرح جسمانی نظام کے امراض اور اس کے ٹھوس درماں کے نقطۂ نظر سے حیاتِ انسانی میں "روح" کی کارفرمائیوں اور اہمیت کی جھلک صاف نظر آرہی ہے، اور یہ دونوں پہلو کہ روح نظامِ جسمانی کے بناؤ اور بگاڑ میں کتنا فیصلہ کن عمل کرتی ہے اس بات کا غماز ہے کہ جسمانی نظام کی بھول بھلیاں میں انسان "روح" کے گم شدہ عقیدے کا سراغ بآسانی لگا سکتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ روح کے وجود کو سمجھ سکتا ہے مگر اس کی حقیقت کو اس سے زیادہ نہیں سمجھ سکتا کہ وہ "حیات و کائنات کے خالق کا ایک حکم" ہے — وہ "امرِ ربّی" ہے۔

دیارِ غرب کے مشاہدات و تاثرات

(۱۰)

سعید احمد اکبر آبادی

فرض شناسی سے امانت و دیانت اور مقصد کے ساتھ خلوص اور کیرکٹر کی مضبوطی وغیرہ اوصاف پیدا ہوتے ہیں، چنانچہ مغرب میں بحیثیت ایک قوم کے یہ اوصاف نمایاں طور پر پائے جاتے ہیں، ظاہرداری، تصنع اور بناوٹ، ظاہر و باطن کی عدم یگانگت اُن کے ہاں کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے، وہ کسی کی تعریف میں مبالغہ کرنا نہیں جانتے، بڑے سے بڑے آدمی کے لئے مسٹر فلاں کہہ دینا کافی ہے، ہمارے ہاں خصوصاً مذہبی حلقوں میں جب تک کسی بزرگ شخصیت کے نام کے ساتھ کوئی شاندار لقب نہ ہو لوگ سمجھتے ہیں اُس کا حق ہی ادا نہیں ہوا، پھر اس معاملہ میں بے حسی کا یہ عالم ہے جو حد درجہ شرمناک ہے کہ ایک بزرگ کے اپنے رسالہ یا اخبار میں اُن کے نام کے ساتھ یہ القابات و خطابات اس کثرت سے استعمال کئے جاتے ہیں کہ اگر اخبار میں دس جگہ اُن کا نام آیا ہے تو ہر مرتبہ نام کے ساتھ وہ القابات و خطابات موجود ہیں، لیکن ان حضرت کو نہ اس پر شرم آتی ہے اور نہ کوئی ناگواری ہوتی ہے، ہمارے یہاں عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ سفارش یا رشوت کے بغیر کام مشکل سے ہوتا ہے، چنانچہ یونیورسٹی میں داخلہ کے لئے سفارش، پھر وظیفہ کے لئے، اُس کے بعد امتحان میں پاس ہونے کے لئے، اور جب یہ مرحلہ بھی گذر گیا تو اب نوکری کے لئے، غرض کہ ہر قدم اور ہر منزل میں سفارش کے بغیر چارہ نہیں اور یہ وبا اس درجہ عام ہے کہ اچھے اچھے مقدس حضرات بھی اس میں مبتلا ہیں، حالاں کہ ایک غیر مستحق شخص کو محض سفارش کی بنیاد پر امتحان میں پاس کر دینا یا اسے کوئی نوکری دے دینا اتنا ہی بڑا

گناہ ہے جتنا کہ چوری کرنا یا کسی کا مال غصب کرلینا۔ اسی بنا پر سفارش کرنیوالا اور اسے قبول کرنے والا دونوں ہی شدید قسم کی معصیت کے مرتکب ہوتے ہیں، لیکن ہم آپ کے اتنے عادی ہیں کہ اس کی قباحت کو ذرا محسوس نہیں کرتے اور اگر ہماری سفارش کو ازراہِ ایمان داری کوئی ٹھکرا دے تو ہم بُرا مان جاتے اور اس کو اپنا دشمن سمجھنے لگتے ہیں، لیکن مغربی اقوام "حق بحقدار رسد" کی قائل ہیں اگر آپ کسی کام کے لائق اور قابل ہیں تو صرف (VACANCY) جگہ کا خالی ہونا شرط ہے، آپ جائیے وہ کام آپ کو فوراً مل جائے گا اور اگر آپ اس کے اہل ہی نہیں ہیں تو لاکھ سفارشیں پہونچائیے، خوشامد درآمد کیجئے، آپ کو کامیابی نہیں ہو سکتی، میں ہندوستان اور پاکستان کے متعدد طلباء کو جانتا ہوں جنھوں نے مونٹریل یا مکگل یونیورسٹیوں سے اپنے اپنے مضامین میں اعلیٰ کامیابی حاصل کی اور جب وہ اپنے وطن گئے تو ان کو کوئی خاطر خواہ ملازمت بڑی جد وجہد کرنے کے بعد بھی نہیں ملی، آخر وہ مایوس و ناکام ہوکر پھر مونٹریل واپس آگئے اور جس بدقسمت کو اپنے وطن میں چار سو روپیہ ماہوار کی لکچر شپ بھی نہیں مل سکی تھی اسے یہاں آتے ہی ڈھائی تین ہزار روپیہ ماہوار کی ریڈر شپ مل گئی اور اب وہ بڑے آرام اور اطمینان سے زندگی گذار رہے ہیں، ان میں سے بعض نے شادی بھی وہیں کرلی ہے اور بعضوں کے ساتھ ان کی مُلکی بیویاں ہیں، مجھے یہ محسوس کرکے افسوس ہوا کہ یہ چند اکا دکا مثالیں نہیں ہیں، بلکہ انڈو پاک کے نوجوانوں میں جو وہاں موجود ہیں یہ رجحان برابر بڑھ رہا اور ترقی کر رہا ہے، میں نے متعدد مواقع پر ان لوگوں سے کہا کہ اس وقت جب کہ آپ کے وطن کو آپ کی خدمات کی ضرورت ہے محض اپنے ذاتی عیش و آرام کی خاطر اس کو فراموش کرکے یہاں رہ پڑنا وطن کے ساتھ غداری اور انسانی شرافت کے خلاف ہے، اگرچہ بعض نوجوانوں نے بگڑ کر کہا بھی کہ ہم اپنے وطن جاکر کریں کیا جب کہ وہاں سفارش کے بغیر کام چلتا ہی نہیں اور ہم یہاں کیوں نہ رہیں جب کہ بغیر سفارش کے اچھی سے اچھی ملازمت مل جاتی ہے، لیکن مجھے خوشی ہے کہ میرے بار بار کے کہنے کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ بعض نوجوان جو تعلیم ختم کرنے کے بعد وہیں رہ پڑنے کا ارادہ کئے ہوئے تھے، انھوں نے اپنا ارادہ بدل دیا اور مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ یہاں شادی نہیں کریں گے اور تعلیم کی تکمیل کے بعد وطن لوٹ جائیں گے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہاں زندگی کی جو آسانیاں اور سہولتیں اور ساتھ ہی رنگینیاں اور رعنائیاں بافراط تمام ہیں، ان کا توڑ اور اُن کا مقابلہ کوئی وعظ و نصیحت کب تک اور کہاں تک کر سکتے ہیں؟ نتیجہ یہ ہے کہ کناڈا میں جہاں آبادی کم ہے اور زمین بہت زیادہ غیر ملکی اور ایشیائی آبادی بڑی سرعت کے ساتھ بڑھ رہی ہے، جہاں تک ہندوستانیوں کا تعلق ہے، سکھ دیہاتوں میں کثرت سے بس رہے ہیں وہاں لیبر کی سب سے زیادہ مانگ ہے اور سکھ انتہائی محنتی اور جفاکش ہوتے ہیں، اس بنا پر انگریزی زبان سے ناواقفیت اور مغربی تہذیب سے ناآشنا ہونے کے باوجود یہ لوگ اپنے گھر والوں کے ساتھ جوق در جوق وہاں پہونچ رہے اور کھیتی باڑی یا محنت و مزدوری کر کے چین اور شانتی کے ساتھ گذارہ کر رہے ہیں، ان میں سے کسی کسی نے ڈاڑھی اور دستار کو خیرآباد کہہ دیا ہے جن میں وہاں میرے ایک ذاتی دوست بھی تھے، لیکن اکثریت اب تک اپنے مذہبی و قومی امتیازات کے ساتھ رہتی ہے، اگر سکھوں کی آبادی میں ترقی کی رفتار یہی رہی تو انگلینڈ کے ساؤتھ ہال (SOUTH HALL) کی طرح جو خاص لندن سے دس میل کے فاصلہ پر ہے، اور جہاں پچھتر ہزار ۷۵۰۰۰ ہندوستانی جن میں اکثریت عظمیٰ سکھوں کی ہے، آباد ہیں، کناڈا کے بعض علاقے بھی جلد ایک دوسرا ساؤتھ ہال بن جائیں گے، سکھوں کے علاوہ ہندو زیادہ تر شہروں میں ہیں، ان میں اکثر تو سلسلۂ تعلیم ہیں، کچھ ایسے ہیں جو تجارت کر رہے ہیں اور ایک اچھی تعداد ان کی بھی ہے جو یہاں ڈاکٹر ہیں یا بعض کمپنیوں سے متعلق ہیں، جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے کناڈا میں اُن کی سب سے زیادہ آبادی (WENNIPEG) وینی پگ میں ہے۔ لیکن یہ مسلمان کسی ایک ملک کے نہیں بلکہ سب ہی ملکوں کے ہیں۔ ۱۲ فروری ۱۹۶۳ء کو پروفیسر اسمتھ انہی لوگوں کی دعوت پر وہاں ایک اسلامک سینٹر کی رسم افتتاح کرنے گئے ہیں، جہاں تک مونٹریل کا تعلق ہے سنا ہے ۱۹۵۲ء تک یہاں صرف دو تین مسلمان آباد تھے، لیکن میرے زمانۂ قیام میں ان کی آبادی ساڑھے چار سو تک پہونچ گئی تھی، ان میں اکثریت پاکستانی مسلمانوں کی ہے، یہ وہاں ملازمتوں میں بھی ہیں، ڈاکٹری بھی کر رہے ہیں اور تجارت میں بھی لگے ہوئے ہیں، اور خوش حال ہیں، ان کا بھی ایک اسلامک سینٹر ہے جو عید بقر عید کی

نمازوں کا اہتمام اور رمضان کے موقع پر افطار وسحر کے اوقات کا نقشہ اور متعلقہ مسائل شائع کرتا ہے اس کے علاوہ اسلام پر کبھی کبھی تقریروں کا یا بعض سوشل تقریبات کا اہتمام بھی کرتا رہتا ہے، اس سنٹر کے ماتحت میرے زمانۂ قیام میں ایک مرتبہ ڈاکٹر سعید رمضان کی تقریر ہوئی تھی جس میں مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم مردوں اور عورتوں نے بھی شرکت کی اور تقریر کے بعد ڈاکٹر صاحب موصوف اور ان کی بیگم کے اعزاز میں پُرتکلف ڈنر بھی ہوا۔ ڈاکٹر سعید رمضان سے میں غائبانہ واقف تھا، یہاں ملاقات ان سے پہلی بار ہوئی، تقریر سے پہلے وہ حبیب اللہ خاں صاحب (جن کو میں اپنے ایک خط مطبوعہ برہان میں متعارف کرا چکا ہوں) کے ہاں شام کی چائے پر مدعو تھے، میں بھی تھا، یہیں اُن سے ملاقات ہوئی اور دیر تک گفت گو رہی، یہ مصر کے اخوان المسلمون کے بانی شیخ حسن البناء مرحوم کے داماد ہیں، عربی زبان کے پُرجوش خطیب اور مقرر اور یورپ کی کئی زبانوں کے عالم اور اسلام کے نامور داعی اور مبلغ ہیں، آج کل جینوا میں ایک اسلامی ادارہ کے ڈائرکٹر ہیں، اس ادارہ کی طرف سے المسلمون نام کا ایک مجلہ بھی عربی زبان میں شائع ہوتا ہے، عید الفطر کے موقع پر اسی اسلامک سنٹر کے ماتحت نماز ڈاکٹر رشیدی (انڈونیشیا) نے پڑھائی اور انگریزی میں خطبہ بھی انہی نے دیا تھا، ۴ مئی ۱۹۶۳ء کو اس سنٹر کی طرف سے عید الاضحیٰ کا انتظام و اہتمام جس خاص طریقہ سے کیا گیا وہ مستفیدنی ہے چوں کہ وہاں کوئی مسجد نہیں ہے اس لئے اس عید کی نماز بھی حسب معمول ایک گرجا میں ہوئی۔ مردوں، عورتوں اور بچوں کا بڑا مجمع تھا۔ سب نہایت خوش وخرم اور لباس فاخرہ میں ملبوس، مردوں کی صفوں کے پیچھے ذرا فصل سے خواتین کی صفیں تھیں، یہ صحیح معنی میں مسلمانوں کا ایک بین الاقوامی اجتماع تھا، حکومت کے قانون کے مطابق کوئی شخص پرائیویٹ طور پر مرغی بھی ذبح نہیں کر سکتا۔ اس بنا پر جو مسلمان قربانی کرنا چاہتے ہیں وہ جانور کی قیمت ادا کر کے اسے مذبح کے سپرد کر دیتے ہیں اور بہت سے ایسے بھی ہیں جو اس مصیبت سے بچنے کے لئے جانور کی قیمت کا صدقہ کر دیتے ہیں، یہاں صدقہ اور خیرات شخصی اور انفرادی طور پر کسی کو دینے کا رواج نہیں ہے، بلکہ خاص خاص ادارے ہیں جو غریبوں اور ضرورت مندوں کی امداد کرتے ہیں اُن کو رقم دے دی جاتی ہے، اس موقع پر مسلمانوں کو جو کچھ خیرات کرنی ہوتی ہے اس کی رقم

اسلامک سینٹر کو دے دیتے ہیں، نماز کے بعد سنٹر کی طرف سے بچّوں کو عیدی تقسیم کی گئی اور پھر سب ایک دوسرے سے گردن ملے، ناشتہ کیا، کافی پی اور پھر منتشر ہو گئے، شب میں ۷ بجے اسی عید کی تقریب میں اسی گرجا میں ایک نہایت مکلّف اور بڑا شان دار ڈنر ہوا جس میں عیسائی اور یہودی مرد اور خواتین بھی کثرت سے مدعو اور اُس میں شریک تھے، سنٹر کے پہلے سے پروگرام کے مطابق ڈنر سے فراغت کے بعد سوا آٹھ بجے میری تقریر ہوئی، اس تقریر کا موضوع اسلام تھا، اس میں میں نے کہا کہ "اسلام" کسی نئے دین اور کسی نئے مذہب کا نام نہیں ہے، بلکہ جب سے دنیا میں مذہب کا وجود ہے اسلام کا بھی ہے اور جتنے پیغمبر آئے ہیں وہ اسی کی تعلیم دیتے اور تلقین کرتے آئے ہیں، اس لئے فرق و اختلاف جو کچھ ہے وہ شرائع اور مناہج کا ہے، اور اس اختلاف کا باعث محض وقت اور زمانہ ہے اس کی وضاحت کرتے ہوئے میں نے کہا کہ اگر حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) حضرت عیسیٰؑ کے زمانہ میں مبعوث ہوتے تو آپؐ کا پیغام وہی ہوتا جو حضرت عیسیٰؑ کا تھا اور اسی طرح اگر حضرت عیسیٰؑ حضرت محمدؐ کے زمانہ میں پیدا ہوتے تو اُن کا پیغام اور اُن کی شریعت وہی ہوتی جو حضرت محمدؐ کی ہے۔ چنانچہ قرآن میں اُن لوگوں کی سخت مذمت کی گئی ہے، جو پیغمبر پیغمبر میں فرق و امتیاز کرتے یا دین میں تفریق پیدا کرتے ہیں، دین جس کا دوسرا نام اسلام ہے از اوّل تا آخر ایک مربوط سلسلہ ہے، جس میں ایک کڑی دوسری کڑی سے ملی اور اس کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ اگر ایک شخص اس پورے سلسلہ کو مانتا ہے تو اسے زنجیر کی ابتدائی اور درمیانی کڑیوں کے ساتھ اُس کی آخری کڑی کو بھی ماننا چاہیے، یہ آخری کڑی پہلی کڑیوں کی ضد یا نفی ہرگز نہیں ہے، بلکہ انہیں کی تکمیل ہے، مقصد خود ستائی نہیں جو میرے نزدیک ایک بدترین اخلاقی عیب و نقص ہے، اور الحمد للہ میں اس سے محفوظ ہوں، بلکہ جتانا صرف یہ ہے کہ کوئی معقول بات اگر کسی کا منہ چڑانے کے لئے نہیں بلکہ محض احقاقِ حق کے لئے ڈھنگ سے اور ایمانداری سے کہی جائے تو اُس کا اثر ضرور ہوتا ہے، چنانچہ پروگرام کے ختم ہو جانے کے بعد جب مجمع منتشر ہوا تو مسلمانوں کے علاوہ متعدد غیر مسلم مردوں اور خواتین نے تقریر کے متعلق اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا، اور کہا کہ آج پہلی مرتبہ ہمیں اسلام کی نسبت یہ معلوم ہوا ہے کہ وہ دوسرے مذاہب کو اور ان کے

پیغمبروں اور اُن کی کتابوں کو کس نظر سے دیکھتا اور اُن کے ساتھ یگانگت محسوس کرتا ہے، بعض مردوں اور خواتین نے مزید گفتگو کرنے کے لئے میرا پتہ اور فون نمبر بھی نوٹ کرلیا تھا، مگر چونکہ اس واقعہ کے چار روز بعد ہی یعنی ۹ رمئی کو میں یہاں سے روانہ ہو رہا تھا، اس بنا پر صرف ایک لڑکی نے تو ایک مرتبہ ٹیلی فون پر اور پھر ایک دوست کی معیت میں کار میں بیٹھ کر اس موضوع پر مجھ سے گفتگو کی، مگر کسی اور کا پتہ نہ چلا۔

یہاں جو مسلمان آباد ہیں اُن میں سُنی بھی ہیں اور شیعہ بھی، حنفی بھی ہیں اور دوسرے ائمہ کے پیرو بھی، لیکن وہ سب اسلامک سنٹر سے وابستہ ہیں اور جمعہ اور عیدین کی نماز اک ساتھ پڑھتے ہیں، میرے زمانۂ قیام میں اس سنٹر کے صدر بھیا بار کر اور سکریٹری عزیزم انصاری تھے۔ اس سنٹر کا خاص فائدہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں مذہبی بیداری اور اپنے دینی معاملات و مسائل کا شعور و احساس قائم رہتا ہے، ورنہ ان ملکوں میں پتہ بھی نہیں ہوتا کہ رمضان کب ہوا، اور بقرعید کس دن ہوئی، چنانچہ میرے ایک پاکستانی دوست جو دلی کے ایک مشہور خانوادۂ ابرار و صلحائے سے تعلق رکھتے ہیں اُن کا ایک لڑکا مونٹریل سے سوڈیڑھ سو میل کے فاصلہ پر ایک کالج میں پڑھتا اور وہاں ذکری بھی کرتا تھا، باپ نے کراچی سے لکھا تو بیٹا محض مجھ سے ملنے مونٹریل آیا۔ یہ رمضان کے بعد کا قصہ ہے میرا خیال تھا کہ یہ نوجوان ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتا ہے جو مذہبی روایات کی پابندی اور احترام کے لئے مشہور ہے اس لئے میں پوچھ بیٹھا کہ اس مرتبہ تم نے کتنے روزے رکھے؟۔ یہ سُنتے ہی وہ چونک پڑا اور بولا " ہیں! کیا یہ مہینہ رمضان کا ہے؟ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ اس نوجوان کا اپنا تساہل اور تغافل تھا۔ ورنہ اُس کا باپ کراچی سے برابر ہر چیز کے متعلق ہدایات بھیجتا اور نماز روزہ کی پابندی اور حلال حرام میں فرق کرنے کی تاکید کرتا رہتا تھا۔

لیکن یوں تو اچھے بُرے کہاں نہیں ہوتے اور خود حجازِ مقدس میں جو لوگ رہتے ہیں وہ سب اصحاب الیمین نہیں، میرا احساس یہ ہے کہ جب سے ایشیائی ممالک آزاد ہونے شروع ہوئے ہیں امریکہ اور یورپ کے ملکوں میں جو مسلمان طلباء ہوں یا غیر طلباء رہتے ہیں اُن کی مذہبی حالت بحیثیتِ مجموعی

بہ نسبت سابق اب کہیں زیادہ بہتر ہوتی ہے اور بعض بعض کی زندگی تو اس معاملہ میں قابلِ رشک ہے۔ یں امریکہ کی مشہور یونیورسٹی ہارورڈ نہیں جا سکا۔ عزیز مکرم ظفر اسحاق انصاری ہو آئے تھے، انھوں نے بتایا کہ وہاں بعض بعض مسلمان طلباء، عرب اور غیر عرب تو اس درجہ کٹر مسلمان ہیں کہ کلاس روم میں جاتے ہیں تو چمڑہ کے تھیلے میں کتابوں اور نوٹ بک کے ساتھ جانماز بھی ڈال کر لیجاتے ہیں، کہ جہاں نماز کا وقت ہوا مصلّے بچھایا اور فریضۂ خداوندی ادا کر لیا۔ ہمارے انسٹیٹوٹ کے طلباء میں انصاری اور معراج الحق اسی قسم کے صالح نوجوان تھے جن سے میں بہت متاثر ہوا۔ انسٹیٹوٹ کے علاوہ میکگل یونیورسٹی اور مونٹریل یونیورسٹی کے مختلف شعبوں میں بھی متعدد مسلمان طلباء تھے۔ جو بڑا اسلامی جوش اور دلولہ رکھتے تھے، ایک پاکستانی نوجوان تو کہتے تھے کہ میں یہاں تعلیم سے فراغت کے بعد محض تبلیغ کی غرض سے مستقل قیام کرنا چاہتا ہوں، مونٹریل کے مسلمانوں میں چند نومسلم امریکن اور کناڈین مرد اور خواتین بھی ہیں اور چونکہ انھوں نے اسلام بغیر کسی دباؤ اور لالچ کے خود اپنی خوشی اور رغبت سے قبول کیا ہے، اس لئے اُن کی مذہبی حالت بہت سے خاندانی مسلمانوں سے کہیں زیادہ بہتر ہے، جو مسلمان یہاں آباد ہو گئے ہیں اُن کے مقامی لوگوں سے ازدواجی تعلقات بھی قائم ہو رہے ہیں، مشرقی مسلمانوں کا امریکہ اور یورپ کی لڑکیوں سے شادی کرنا عام بات ہے۔ لیکن میں نے یہاں دیکھا مشرقی ملکوں کی (جن میں ہندوستان اور پاکستان بھی شامل ہے) متعدد لڑکیوں نے امریکہ اور کناڈا کے لڑکوں سے، جہاں تک مجھے معلوم ہے اُن کے مسلمان ہو جانے کے بعد شادی کر لی ہے۔ غرض کہ یہ انسانی تہذیب و تمدن کا ایک بالکل نیا دور ہے۔ جس میں مشرق و مغرب اور رنگ و نسل کے حدود و امتیازات ختم ہوتے جا رہے ہیں اور پورا انسانی معاشرہ ایک خاندان، اور ایک عائلہ کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے اور عالمی شہریت کے تصور کو عملی جامہ پہنانے کی منزل کی طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہا ہے۔ ممکن ہے بعض حضرات کو بُرا لگے لیکن حقیقت یہ ہے کہ طبقاتیت اور گروہ بندی کا شعوری یا غیر شعوری طور پر جو احساس مجھے اپنے ملک میں

ہوتا ہے وہ ان بلادِ غیر میں کبھی نہیں ہوا - ایک شخص اپنے خاندانی مذہب کو ترک کر کے کوئی دوسرا مذہب قبول کر لیتا ہے اور کسی کے ماتھے پر شکن تک نہیں پڑتی، اچھے اچھے خاندانوں کی حسین و جمیل لڑکیاں حبشی نوجوانوں کے باہوں میں باہیں ڈال کر گھومتی پھرتی ہیں اور کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا، امیروں اور دولتمندوں کو اپنی دولت پر گھمنڈ نہیں ہے- اور غریب احساسِ کمتری کا شکار نہیں - مسلمان فطرتاً عقیدۂ توحید وحدتِ انسانیت، اور مساواتِ بنین و بناتِ آدم کے تصوّر کے باعث یونہی سب سے زیادہ وسیع المشرب اور وسیع الخیال ہوتا ہے اس لئے اسے ایسے معاشرہ میں کھپ جانے میں ذرا دقّت اور دشواری پیش نہیں آتی، اور یہی حال اُن مسلمانوں کا ہے جو یہاں آباد ہیں، لیکن ساتھ ہی انہیں اس کا احساس ہے کہ وہ جہاں کہیں بھی ہوں اُن کے اپنے تنظیمی ادارے اور مراکز ہونے چاہئیں جو ان کے دینی اور ثقافتی امور و مسائل کی نگرانی کریں، مسلمان بچّوں اور بچّیوں کے لئے دینی تعلیم کا بندوبست کریں اور ان میں اسلامی روح کو مُردہ نہ ہونے دیں، یہ احساس صرف اُنہیں لوگوں کا نہیں ہے، بلکہ دنیا کے مختلف حصّوں میں جو مسلمان حکومتیں قائم ہیں اُن کو بھی مغربی ممالک میں آباد مسلمانوں کا خیال اور فکر ہے، چنانچہ امریکہ کے دارالسلطنت واشنگٹن اور لندن میں جو بڑے پیمانہ پر اسلامک سنٹر قائم ہیں کم و بیش سب ہی مسلمان حکومتیں اُس کے اخراجات میں ایک دوسرے کی شریک و سہیم ہیں، اوّل الذکر سنٹر خاص طور پر بہت اہم ہے- اس کے اجراء و قیام میں بڑا حصّہ جمہوریۂ متحدہ عربیہ کا ہے - جینوا کا سنٹر جس کا ابھی ذکر ہوا وہ بھی ان مغربی ممالک کے مسلمانوں سے رابطہ رکھتا ہے اور اس کے کارکن دورے بھی کرتے رہتے ہیں، اگرچہ ان سنٹروں کو جتنا فعال ہونا چاہئے، وہ اتنے نہیں ہیں تاہم ان کی افادیت یہ ضرور ہے کہ مسلمان ایک تنظیم سے وابستہ ہیں -

مونٹریل کی شہری زندگی میں جن مسلمانوں کی مذہبی زندگی سے میں متاثر ہوا اُن میں سے متعدد حضرات کا تذکرہ میرے خطوط مطبوعۂ برہان میں آچکا ہے - اُس کے اعادہ کی ضرورت نہیں،

ایک صاحب کا البتہ اُن خطوط میں ذکر نہیں آیا۔ یہ مسٹر حسن صدوقی ہیں، نسلاً ایرانی ہیں، اور پیرس میں تعلیم پائی ہے۔ بڑے لائق اور قابل انجنیئر ہیں۔ میں جب مونٹریل سے روانہ ہوا ہوں تو وہ شادی کی غرض سے ایران گئے ہوئے تھے، یعنی میرے زمانۂ قیام میں مجرد تھے، کہنے کو شیعہ ہیں مگر حال یہ ہے کہ ہر دینی کام میں ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے، اور انسٹیٹوٹ میں جمعہ کی نماز کا اہتمام وانتظام وہی کرتے تھے، ہمارے ساتھ نماز پڑھتے تھے، جمعہ کی نماز پڑھنے جو حضرات آتے تھے، اُن میں سے اکثر جمعہ کی نماز سے فراغت کے بعد ہی عصر کی نماز بھی باجماعت پڑھ لیتے تھے، مگر بارکر، خواجہ محمد شفیع۔ انصاری اور میں اور ایک دو اور اس عصر کی جماعت میں کبھی شریک نہیں ہوئے۔ حسن صدوقی خلفائے راشدین کا ذکر بالکل اہلِ سنت کے طریقہ پر بڑے ادب واحترام سے کرتے تھے اور قرآن مجید کے ساتھ تو اُن کے شغف کا یہ عالم تھا کہ رمضان کے مہینہ میں متعدد بار اُن کے ساتھ موٹر کار میں سفر کرنے کا اتفاق ہوا۔ اپنی کار وہ خود چلاتے تھے، جہاں کار روانہ ہوئی اور انھوں نے ہم لوگوں سے قرآن سُنانے کی فرمائش کی، باری باری ہر شخص قرآن سناتا تھا، وہ خود بھی بڑے وجد کے ساتھ پڑھتے تھے، اس کے بعد نعت میں فارسی کے اشعار ایک خاص لحن اور جذب و شوق کے ساتھ پڑھتے تھے، — مونٹریل میں احمدی یا قادیانی حضرات بھی خاصی تعداد میں ہیں ان حضرات کے ایک بزرگ میاں عطا، اللہ ایڈوکیٹ جو غالباً سیالکوٹ کے رہنے والے ہیں۔ میرے بڑے کرم فرما اور مہربان تھے، ان کا کم وبیش پورا خاندان ہی وہاں آباد ہو گیا ہے۔ بیٹی۔ بہو۔ بیٹا۔ اور داماد سب ہی ڈاکٹر اور خوش حال ہیں، میاں صاحب نے متعدد شاندار ڈنر کھلائے، اور اپنے متعلقین کے ساتھ کئی مرتبہ میری قیام گاہ پر بھی آئے — یہ وسیع المطالعہ، بڑے خوش ذوق اور مذہبی شخص ہیں، میری متعدد کتابیں انھوں نے پڑھی تھیں اور ان کی بڑی تعریف کرتے تھے، اُن کے مکان پر رات گئے دیر تک علمی اور دینی مباحث ومسائل پر مذاکرہ رہتا تھا۔ مگر وہ احمدی یا قادیانی تھے، ! یہ میں صرف اس لئے کہہ رہا ہوں، کہ